عابد خورشید/ شاہد نواز

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

لیکچرار شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

محاسن شعری کا تلمیح سے انسلاک

(بحوالہ راشدؔ)

Abid Khurshid

PhD Scholar, Urdu Department, Sargodha University, Sargodha.

Shahid Nawaz

Lecturer, Urdu Department, Sargodha University, Sargodha.

Allusion as a Poetic Tool (with reference to N.M.Rashid's works)

N.M.Rashid is the one of the top most poets in modern era of Urdu literature. He is unparalleled for emancipating Nazm from the supremacy of Ghazal and introducing modern tendencies in the poetry. Rashid's poetry having several trends uses Allusion as special trend which has been taken from literary predecessors. Rashid has the capability to connect Allusion with the contemporary age. He has not derived Allusions merely from religion and culture but many of Allusions are his intellectual introduction. Modern poetry can be proud of Rashid for bestowing dependable status to Nazm. In the present article Allusions used by Rashid have been discussed critically.

زبان و اَدب میں الفاظ کا برتاؤ مابعد الطبیعیاتی سطح پر اپنے معانی کی طرف ایک اشارہ ہی ہے اور تلمیح (Allusion) ایسا اشارہ ہے جو لفظ کے ذریعے کسی واقعے (جس کی تاریخی حیثیت ہو)، کردار، عمارت، حکایت وغیرہ سے منسلک ہو۔ نظم اور نثر ہر دو اصناف میں تلمیح کا جواز ہے۔ لیکن بطور شعری حربہ کے اِس میں قوتِ نمو کہیں زیادہ ہے۔ محاسنِ شعری میں اِس طبعی میلان کی صراحت اِس لیے بھی ضروری ہے کہ صنائع بدائع اگرچہ علم بیان سے متعلق ہیں لیکن تلمیح، جس کا بنیادی تعلق علم بدیع سے ہے، دیگر شعری صنعتوں سے بھی اِس کا ربط غیر فطری نہیں۔ یہ معاونین اپنے اوصاف رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی خوبیوں میں

حصہ دار ہیں۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''استعارہ'' میں کچھ نہ کچھ ''تشبیہ'' کا حصہ بھی ہے۔بعض صناعت ایک ہی شاخ پر کھلے ہوئے پھولوں کے مانند اپنا الگ وجود بھی رکھتی ہیں' اور ایک مہا وجود کا حصہ بھی ہیں۔مزید یہ کہ ان کی جڑوں (Roots) کو آسانی سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ یہ ریشم کے نازک تاروں کے مصداق ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں اور پھر اِن کی مکمل علاحدہ شناخت بھی غیر منطقی ہوگی۔

اِس تناظر میں کسی قسم کا خطِ امتیاز کھینچنا شعری بُنت سے متصادم ہوسکتا ہے۔اِس کا ہرگز مفہوم یہ بھی نہیں کہ تشبیہ' استعارہ' اقتباس' اصطلاح یا اشارہ میں کوئی افتراق بے معانی عمل ہے۔کیونکہ تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں یا اُسے ایک منظّم صورت میں کسی نظام کے تحت شمار کرنے کے لیے ایک نامیاتی وحدت کی ضرورت ہے' یا یوں کہنا چاہیے کہ ایک معنوی ارتباط از حد ضروری ہے۔ جو اِسے محاسنِ شعری فراہم کرتے ہیں' ورنہ تو تخلیقی عمل ''بوجھو تو جانے'' کی عملی تصویر بن کر رہ جائے گا۔جہاں تک اِس سوال کا تعلق ہے کہ یہ محاسنِ شعری کس طرح شعری عمل کو مہمیز دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی افادیت کو بڑھانے یا معنوی اشتراک میں مددگار ہو سکتے ہیں تو اِس کے لیے ہمیں شعریاتی کائنات کا زیرک نظری سے مطالعہ کرنا ہوگا۔

یہ شعر ملاحظہ کیجیے :

آگ ہے' اولادِ ابراہیم ہے' نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

اِس شعر کے دونوں مصرعوں میں براہ راست کوئی تشبیہ نہیں۔لیکن زیریں سطح پر اِن مصرعوں میں ''زمان'' کی تشبیہ موجود ہے۔یعنی آج ''آگ'' بھی ہے'' ''اولادِ ابراہیم'' بھی ہے اور ''نمرود'' بھی ہے۔کیا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا اور جس طرح وہ امتحان سے گزرے' کیا آج پھر اُسی صورتِ حال کا سامنا ہے۔تشبیہ کے اِس عنصر نے ''آگ''،''اولادِ ابراہیم'' اور ''نمرود'' ایسی تلمیحات کو پُر زور بنا دیا ہے اور شعر کی اثر پذیری کو نمایاں کر دیا ہے۔اِسی طرح غالبؔ کا یہ شعر دیکھیے :

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے

ساغرِ جمشید' پیالۂ جمشید' جامِ جمشید' اِس تلمیح کا ایک پس منظر تو ہمارے اذہان میں محفوظ ہے لیکن غالبؔ نے ''ساغرِ جم'' سے ''جامِ سفال'' سے جو ربط بنایا ہے کیا اُس نے شعر کی چاشنی یا اُس نے حسن میں اضافہ نہیں کیا؟ اور اختلافی ڈھانچے میں تشکیل کا پہلو کس طرح تلاش کیا ہے؟

محاسنِ شعری کے ساتھ ساتھ بعض اوقات محض روزمرہ یا لہجے کی تبدیلی بھی شعر کے آہنگ میں رنگ بھر دیتی ہے۔

مثال کے طور پر:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

اگر ہم پہلے مصرعے کو ذرا بے نیازی سے ادا کریں یعنی ''ہوا کرے کوئی'' ہمیں تو اپنے دُکھ کی دوا سے غرض ہے۔دوسری

صورت میں ''ہوا کرے کوئی'' کو تیقن سے ادا کرنے سے لازم موجودگی کا تاثر شعر کے مفہوم کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے اور شعر میں موجود تلمیح اس کے اثر کو دوبالا کر دیتی ہے۔ تیسری صورت مابہ الامتیاز کی ہے یعنی ''ہوا کرے کوئی'' اور ''دوا کرے کوئی'' اِس طرح سے درجنوں مثالیں ہیں جو اِس موقف کی تائید کے لیے پیش کی جا سکتی ہیں۔ استثنائی صورت میں کوئی لفظ بطور استعارہ بھی استعمال ہوتا ہے' بطور علامت بھی اور وہی لفظ تلمیحاً بھی برتا جاتا ہے۔ جس کی سب سے عمدہ مثال لفظ ''کربلا'' ہے۔ جو ایک ہی وقت میں علامت بھی ہے' استعارہ بھی اور تلمیح بھی۔

راشدؔ کی شاعری کا مطالعہ متنیت کے حرکی اور حسی جواز کا متقاضی ہے' اُن کے ہاں تلمیح کا حربہ بہت توانا ہے وہ رجحانات کو تلاشنے کے لیے نئے خیالات' نئے تصورات کو قبول کرنے کے لیے تلمیح کو بھی تجربے کی آنچ پر قلب ماہیئت کے ذائقے سے وسعت آشنا کر سکتے ہیں۔

راشدؔ شناسی کے حوالے سے ڈاکٹر آفتاب احمد کے بہت سے مضامین موضوعِ بحث ہوئے' جن میں نہ صرف راشدؔ کی شخصیت کے نشیب و فراز کی کئی گتھیاں سلجھتی ہیں بلکہ اُن کی شاعری کا بھی زیرک نظری سے مطالعہ کیا گیا ہے' راشدؔ کے ہاں تلمیح کے برتاؤ کے حوالے سے' ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں ''راشدؔ کے ہاں تلمیح ایک نئی زندگی پاتی ہے کیونکہ وہ اسے روایت کی دُنیا سے اُٹھا کر تجربے کی چیز بنا دیتے ہیں۔''(۱)

جہاں تک علامت کا ذکر ہے تو دیگر شعری اصطلاحات کی بہ نسبت علامت اور تلمیح کا آپسی تعلق کہیں زیادہ قریب ہے۔ بیشتر علامتیں تلمیحی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ علامت اور تلمیح میں ''زمانی بُعد'' ایک یکساں خوبی ہے۔ خاص طور پر راشدؔ کے ہاں علامت کو تلمیح کا درجہ حاصل ہے' جیسا کہ ڈاکٹر ضیاء الحسن نے ''نئے آدمی کا خواب'' میں لکھا ہے کہ ''راشدؔ تلمیح کو علامت بنا دیتے ہیں''۔(۲)

کسی علامت یا استعارے کو نئے مفاہیم دینا کسی ہُنر مند شاعر کا ہی کمال ہو سکتا ہے۔ یہ توقع کسی ایسے تخلیق کار سے کیسے کی جا سکتی ہے جو کسی ''ہیئت'' سے آزاد نہ ہو سکے۔ تجربے کے لیے مروجہ سانچوں کو توڑنا' فطری تقاضا ہے۔ شاعر کا وژن اُس کی علامت نگاری سے کُھلتا ہے۔ راشدؔ کے ہاں تمثیل کا انداز ایسا منفرد ہے کہ وہ اُسے بھی علامت کے درجے سے مس کر دیتے ہیں۔ راشدؔ نے نہ صرف علامت اور استعارے کو نیا پیرہن دیا بلکہ تلازمات میں بھی جدت پیدا کی۔ اختر امان لکھتے ہیں:

> پُرانی مروج شاعری کا ساز و سامان الفاظ' تلمیحات' اشعار' استعارے' کنائے کے ساتھ ایسے تلازمات وابستہ تھے کہ ان کو کوئی معنی خیز شکل دینا مشکل نظر آتا تھا۔ اس بات کے پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے شعر کی ہیئت اور قالب میں تبدیلی لانے کا سوچا۔(۳)

استعارہ' تشبیہ سے وسعت رکھتا ہے' یعنی شعری بنت میں اِس کا پھیلاؤ قوس کے مانند ہے۔ زمانی بندش' ثقافتی حد بندیاں' زبان کی فعالیت سے علی الرغم ایک ایسی فضا میں اپنی وجودی استعداد متحرک رکھتا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد اپنی کتاب ''ن' م' راشدؔ ..... شخص اور شاعر'' میں لکھتے ہیں:

> عام لفظوں کے انتخاب سے قطع نظر راشدؔ کے ہاں تشبیہوں اور استعاروں کے انتخاب میں جو ندرت اور تازگی

پائی جاتی ہے، وہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔اس لیے کہ یہ تشبیہیں اور استعارے زیبِ داستاں کے طور پر نہیں بلکہ تخلیقی تجربے کا تار و پود بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔(۴)

مجازی معنویت کی حامل یہ شعری صنعت جب میکانکی عمل سے گزرتی ہے تو اُس لگے بندھے طریقے سے انکشافی اور اکتشافی مراحل پر اپنے نقوش نمایاں کرتی جاتی ہے اور مستعار لہ کا تناظر وسیع تر ہو جاتا ہے۔استعارہ مچان سے جھانکنے کا رویہ اُبھارتا ہے، لیکن اِس کے لیے منظر کا خوبصورت ہونا مشروط ہے۔

قرۃ العین حیدر قدیم و جدید ایرانی تہذیب کی سرایت کو راشدؔ کے ہاں تلمیحات اور استعاروں کی دل آویزی کی بڑی وجہ قرار دیتی ہیں، اُن کا کہنا ہے :

> علامت اور تلمیح کے ذریعہ اپنے دور کی معلومات پر تبصرہ فارسی اور اُردو شاعری کی قدیم روایت ہے۔لیکن راشدؔ نے جدید ایرانی شاعری سے گہری واقفیت کی بدولت تلمیحوں اور استعاروں کو ایک بڑی انوکھی اور دل آویز زینت بخشی۔(۵)

اِس امر کو یوں بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ کسی روایت سے محض افتراق میں اشتراک کا مخالف رویہ ہی نہ ہو بلکہ بقول ڈاکٹر ستیہ پال آنند:

> ..... جدیدیت سے مراد صرف سربمہر استعاروں، علامتوں اور تلمیحوں سے روگردانی ہے جو روایتی شاعر کا سکۂ وقت ہوتے ہیں؛ کلیتاً صحیح نہیں ہے۔اس بات کا تعلق صرف اسلوب سے ہے، زندگی کے بنیادی حقائق سے نہیں ہے۔(۶)

ذوالکفل حیدر کی یہ رائے بھی ملاحظہ کیجیے :

> راشدؔ کے استعارے اور تراکیب ایک نئی فکری کائنات کا پتہ دیتے ہیں، اور صاف امیجری میں مدد کرتے ہیں۔ان کے استعارے سے Wanting to say more کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔(۷)

اب مختصراً محاورہ، روزمرہ یا ضرب الامثال سے تلمیح کے انسلاک کا ذکر کرتے ہیں۔محاورے اور ضرب المثل میں الفاظ کا تعین طے شدہ ہوتا ہے۔مختصر الفاظ، محاورے کو کلیدی حیثیت فراہم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔پھر جہاں بھی زبان و اَدب کا حلقہ ہے کسی بھی محاورے کا مفہوم ایک ہی وقت میں متضاد معانی نہیں رکھتا۔کم از کم یک رُخی معنویت ضرب الامثال میں بھی پائی جاتی ہے۔یعنی کوئی محاورہ ایک خاص عرصے کی ریاضت کے بعد ہی وجود میں آتا ہے۔تلمیح میں بھی زمانی فاصلہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، یا ایک ضرب المثل یا قولِ زریں بہت سی کٹھالیوں سے گزر کر اپنے معانی کا تعین کرتا ہے۔پھر اِس کی حیثیت زبان میں جغرافیائی تبدیلی کو نظر انداز کر دیتی ہے۔یعنی اُردو میں ایک محاورہ دُنیا بھر میں جہاں جہاں اُردو زبان بولی جاتی ہے، اپنا ایک ہی مفہوم رکھتا ہے۔یہ چند اوصاف محاورہ اور ضرب المثل کو تلمیح کے زیادہ قریب کر دیتے ہیں۔بہت سی ضرب الامثال اور محاوروں میں تلمیحی تلازمات موجود ہوتے ہیں، ایک اور صورت مختصر ہونے کی بھی ہے یعنی محاورہ یا ضرب المثل میں کم سے کم الفاظ میں بات مکمل ہو جاتی ہے اور تلمیح کی صورت بھی یہی ہے۔بعض اوقات محض تین چار الفاظ میں ہی محاورہ اپنا مفہوم واضح کر دیتا ہے۔یہی صورت ضرب المثل کی بھی ہے۔محاروں اور ضرب الامثال کے بہت سے کردار تلمیحی غلاف میں چھپے ہوئے

ہوتے ہیں۔ اور اُن میں جو زیریں سطح پر قصے یا کہانیاں ہیں اُن سے ہم عام طور پر واقف ہوتے ہیں۔ مثلاً شیخ چلی، لال بجھکڑ، جون پور کا قاضی، چالیس چور، ٹیڑھی کھیر، بھیگی بلّی، وغیرہ۔ مزید برآں محاورے کی صورت بھی اس لحاظ سے زیادہ مختلف نہیں: اگر کسی شعر میں کوئی تلمیح محاورتاً آ جائے تو گویا بات دو آتشہ ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر :

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

برات عاشقاں برشاخِ آہو

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

تمثیل نگاری میں شعراء کے ہاں جس ''خوبی'' کو ''خامی'' کے طور پر دیکھا جاتا ہے، وہ اُن کا بیانیہ انداز ہے، جو اکثر و بیشتر غیر شعوری طور پر نظم یا غزل میں دَر آتا ہے۔ مغنی تبسم نے نہایت لطیف انداز میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> شاعری میں شبیہ نگاری Imagery کو عام طور پر استعاروں اور تشبیہوں کے علاوہ (افعالی تیز) اور صفات جیسے اجزائے کلام کے مخصوص استعمال تک محدود سمجھا جاتا ہے اور صوتی استعارے کی طرف بہت کم نظر جاتی ہے۔ راشدؔ کی شاعری کے ''بیانیہ'' ہونے کا جو مغالطہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی یہی ہے۔(۸)

شاعری داخلیت کی واردات سے منسلک ہے، لیکن نظم میں اِسے کُلی طور پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ نظم کے بطون سے اُبھرنے والی کیفیت خارج کی مرہون منت ہوتی ہے، تخلیقی عمل کی اِس پراسرار سرسراہٹ کو ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے راشدؔ کے ہاں اِس انداز سے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> اُنھوں [راشدؔ] نے خارج کو باطن کی آنکھ سے آنکھ سے دیکھنے کی سعی کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری تلازمات اور استعاروں میں ایک انوکھا پن جھلکتا ہے۔(۹)

فطری بات ہے کہ جب کسی تحریر میں ایسی ضرب المثل یا محاورہ آتا ہے تو اُس کا اثر کہیں بڑھ جاتا ہے۔ یہاں اِس اَمر کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ عوامی قبولیت بھی لسانیات کے خارجی پیکر کو اپنے حصار میں رکھتی ہے۔ اس لیے کہاوتیں، ضرب المثال، محاورے، اصطلاحات یا اقوال زریں وغیرہ ایسے افعال ہیں جن میں زبان سانس لیتی ہے اور ان معاونین کے اشتراک سے ظہور میں آنے والے اوصاف ہی شعری لطافت کو معیار بنانے میں اپنا اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔

تلمیح کا ایک مزید پہلو جو ہمیں اپنی رسموں اور روایتوں میں نظر آتا ہے، جن کا ثقافتی تناظر کسی بھی طرح غیر اہم نہیں۔ یہ رسمیں ہمارے معاشرتی یا تہذیبی پس منظر میں اپنا بھرپور اظہار رکھتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے مذہبی تصورات میں بھی اِن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ آپ ملاحظہ کیجیے کہ ''بسم اللہ کی رسم'' کے ساتھ کوئی ''تاریخی'' واقعہ کسی وضاحت کے ساتھ ہمارے اذہان میں فوری طور پر نہیں آتا۔ لیکن اِس رسم کی قدامت سے ہم واقف ہیں اور اِس کے بہت سے لوازمات ہمارے دیکھے بھالے ہیں۔ اسی طرح ''آمین کی رسم'' یا ''رت جگا'' یا پھر ''نیاز'' کی رسم وغیرہ کا آغاز یقیناً کسی نہ کسی واقعے سے مشروط ہے۔ اگر کسی ایک رسم کا طویل عرصے معاشرے میں چلن ہے تو یہ بات بہ ذاتِ خود اپنی اہمیت و افادیت کا جواز ہے۔ اِن روایات میں مقامیت کا عُنصر تلمیح کے دائرے کو محدود نہیں کرتا۔ اگر اِس بات کو معیار بنایا جائے پھر تو ہر تلمیح کسی نہ کسی سطح پر محدود

ہوسکتی ہے !

ع اپنی اپنی وسعتوں میں قید ہے سب کا وجود

کے مصداق تلمیح کے لیے یہ اَمر لازم قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اُس کی حیثیت ''عالمی'' ہی ہو۔ ایسی تلمیحات کی تعداد بہت کم ہوگی۔ یقیناً ایسے بہت سے موضوعات ہیں جو کئی ایک زبانوں اور تہذیبوں کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ خاص طور پر وہ مذہبی واقعات جو ایک سے زائد مذاہب اور ایک ہی زائد زبانوں میں موجود ہیں؛ جن میں حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ، حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ، زمین کی پیدائش، کائنات کا وجود، دیگر ایسے بہت سے واقعات جنھیں مختلف مذاہب نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بیان کیا ہے۔ قریباً ہر بڑی زبان اِن خزائن سے مالا مال ہیں، لیکن تلمیح کا اپنی زبان کے دوہرے اظہار یعنی اُس کے جسم اور روح سے براہ راست ہوتا ہے۔

زبان جن عوامل سے گزر کر وجود پاتی ہے، اُن کی اِساس بہر حال ''لفظ'' ہے۔ جس کا ثقافتی مظہر اُس معاشرے کا عکاس ہے۔ اور جیسے جیسے معاشرہ کمپوز ہوتا ہے اُسی طرح زبان کی بلاغت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اور ہم کسی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ زبان جس طرح بلیغ ہوگی اُس میں تلمیحات کا ذخیرہ اُتنا ہی نمایاں ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر آفتاب احمد''ن م راشد شاعر اور شخص'' (کراچی) دانیال ۱۹۹۵ء ص ۳۱

۲۔ ڈاکٹر ضیاء الحسن نئے آدمی کا خواب (لاہور) اظہار سنز ۲۰۰۲ء ص ۲۰

۳۔ اختر امان مصاحبہ ن م راشد سے چند سوالات مشمولہ ''مقالاتِ راشد'' تحقیق و تدوین شیما مجید (اسلام آباد) الحمراء پبلشنگ ستمبر ۲۰۰۲ ص ۴۰۲۔۴۰۳

۴۔ ڈاکٹر آفتاب احمد''ن م راشد شاعر اور شخص'' (کراچی) مکتبہ دانیال ۱۹۹۵ء ص ۵۳

۵۔ قرۃ العین حیدر مضمون''ن م راشد'' مشمولہ رسالہ ''سطور'' (۴) مرتبین: سید عامر سہیل، شوکت نعیم قادری، ڈاکٹر نعمت الحق، ڈاکٹر علی اطہر (ملتان) بیکن بکس ۲۰۰۳ء ص ۱۸۵

۶۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند مضمون ''وزیر آغا: خطوط سے اقتباسات پر مبنی ایک دستاویز'' مشمولہ سہ ماہی (لاہور) ''ادبِ معلیٰ'' جنوری تا مارچ ۲۰۱۱ء ص ۷۱

۷۔ ذوالکفل حیدر مضمون ''حسن کوزہ گر'' مشمولہ رسالہ ''بنیاد'' (لاہور) لمز شمارہ ا مدیران یاسمین حمید، ڈاکٹر معین نظامی ۲۰۱۰ء ص ۲۹۲

۸۔ مغنّی تبسم تجزیہ نظم ''مجھے وداع کر'' مشمولہ ''راشد صدی: منتخب مضامین'' مرتبین: پروفیسر ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر ضیاء الحسن (اسلام آباد) مقتدرہ قومی زبان ۲۰۱۰ء ص ۵۴۱

۹۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش مضمون ''ن م راشد'' مشمولہ رسالہ ''بنیاد'' (لاہور) لمز شمارہ ا مدیران یاسمین حمید، ڈاکٹر معین نظامی ۲۰۱۰ء ص ۳۰۳